کلامِ جاہلی سے استفادہ اور تفسیر تدبرِ قرآن

*اختر حسین عزمی

**عبدالقادر بزدار

***عتیق الرحمٰن

Abstract

A complete command over language of a work is necessary to understand it properly. To have a command on language does not mean to have a command over the lexicon of the particular language but a command over its literature is also important. The Holy Quran is a work of Allah Almighty in Arabic language and it enjoys a high position as regards its eloquence and conciseness. In order to understand it the knowledge of Arabic literature is important. The interpretation of various Quranic verses is not possible if we forget this fact. It may also lead the reader to grave mistakes and misguidance. The Sahaba R.A were well aware of the Arabic literature and there is no doubt it was an established rule among them. They took full advantage of Arabic literature in understanding Holy Quran. This custom of taking advantage from literature can be seen in the later eras. Among the Tafaseer written in Sub-continent the tafseer of Maulana Islahi 'Tadabur-e-Quran' is an emblem of this mode of study. In this article the importance and the custom of using Arabic literature is analyzed. Moreover this article presents a critical evaluation of the above mentioned Tafseer 'Tadabur-e-Quran'.

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج، ٹاؤن شپ، لاہور

**اسسٹنٹ پروفیسر، پوسٹ گریجوایٹ سنٹر، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان

***اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور

قران مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب کی حیثیت سے قیامت تک کے لئے رشد وہدایت کا ذریعہ ہے۔اور اس کی تفہیم کی خاطر تفسیر کا سلسلہ نزول سے تا حال جاری ہے۔اس کتاب سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ایسے اصول وقواعد کی پابندی کی جارہی ہے جنہیں صحابہ کرام کے اجتماعی طرزِ عمل اور امت مسلمہ کے اجماعی رویہ نے مدون کیا۔

تفسیرِ قرآنی کے بعض اصول خود قرآن سے مستنبط ہیں اور کچھ کو نبی مکرم نے بیان فرمایا اور کئی ایک وہ ہیں جنہیں صحابہ کرام نے وضع کیا۔ان اصول وضوابط کی فہرست میں ایک اہم اور نمایاں اصول کلامِ عرب سے استفادہ ہے۔علم تفسیر میں اس اصول کا اطلاق عہد صحابہ سے جاری ہے۔

برصغیر میں علم تفسیر کی تشکیل جدید کے حوالے سے ایک اہم نام ''مولانا امین احسن اصلاحی'' کا ہے جنہوں نے اپنی شاہکار تصنیف ''تدبرِ قرآن'' میں کلامِ عرب سے باقاعدہ طور پر استفادہ کیا۔اس اعتبار سے یہ تفسیر اپنی ہم عصر دیگر تفاسیر میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔

کلامِ عرب سے استشہاد کی تاریخی روایت:

قرآن مجید کا نزول بلیغ عربی زبان میں ہوا اور اس میں پیغام الٰہی کے موثر ابلاغ کے لئے عربی استعارات، کنایات، محاورات اور تعبیرات وغیرہ کا بکثرت استعمال کیا گیا۔چنانچہ قرآن کے پیغام کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے الفاظ کی مکمل معرفت حاصل کی جائے۔یہی وجہ تھی کہ آیاتِ قرآنی کی وضاحت اور تفسیر کی غرض سے کلامِ عرب سے استشہاد صحابہ کرام کے ہاں معروف ہوگیا۔سیدنا عمر فاروقؓ کو بکثرت جاہلی اشعار یاد تھے اور وہ انہیں قرآن کے الفاظ کی تشریح میں حسب موقع بطور دلیل بھی پیش فرمایا کرتے تھے۔آپ کو شعراءِ عرب کا کلام یاد بھی تھا اور آپ ان شعراء کے کلام کے بارے میں اپنی رائے بھی رکھتے تھے[1]۔اس اعتبار سے آپ اپنے زمانے کے نقاد ہیں۔آپ قرآن مجید کی توضیح اور اس کے الفاظ کی تشریح کے حوالے سے جاہلی اشعار سے استفادہ کے قائل تھے۔جیسا کہ آپ کے قول سے واضح ہے۔آپ نے فرمایا: **یایھاالناس علیکم بدیوانکم شعر الجاھلیة فان فیه تفسیر کتابکم و معانی کلامکم**[2]۔

سیدنا عمر فاروق کی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے مفسرِ قرآن بھی لغتِ عرب کی طرف رجوع

کرتے۔ آپ نے فاطر السموات کے معنی اس وقت جانے جب دو بدوی آپ کے پاس ایک کنویں کا جھگڑا لے کر آئے تو ان میں سے ایک نے کہا: انا فطرتھا (میں نے یہ کنواں سب سے پہلے کھودا ہے) تو یہی موقع تھا کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے اس بدوی کے قول سے قرآن کے لفظ فاطر کے معنی سمجھے[3]۔ آپ نہ صرف قرآن کے مشکل مقامات کے حل کے لئے قدیم عربی شاعری سے استفادہ کے قائل تھے بلکہ قرآن کی تعلیم کے دوران ان اشعار کا خود بھی استعمال فرماتے۔ آپ جاہلی استعارات کو قرآن مجید میں وارد شدہ الفاظ کے معانی کے استفسار کے موقع پر بطور نظیر پیش فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے ایسا محض چند ایک مواقع پر نہیں کیا بلکہ ایسے مواقع کی تعداد کثرت میں ہے[4]۔

اس سلسلے میں خارجی سردار نافع بن الارزق سے آپ کے مکالمہ کی مثال مشہور ہے۔ ایک حج کے موقع پر اس سردار نے سیدنا ابن عباس سے کئی ایک الفاظِ قرآنی کے معانی پوچھے تو آپ نے اُسے بتاتے ہوئے اشعار جاہلی سے برابر استدلال کیا اور ایک ہی نشست میں ایک سو کے لگ بھگ اشعار کو بطور دلیل پیش فرمایا[5]۔

آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح میں کلامِ عرب سے استفادہ و استشہاد عہد صحابہ کے بعد بھی جاری رہا۔ ابو بکر بن الانبار فرماتے ہیں: قد جاء عن الصحابۃ والتابعین کثیر الاحتجاج علی غریب القرآن ومشکلہ بالشعر 6۔ صحابہ کے بعد قدیم مفسرین کرام نے بھی اس روش کو اپنائے رکھا۔ اس سلسلے میں امام قرطبی، امام طبری، امام زمخشری اور امام رازی وغیرہ کے نام نمایاں طور پر پیش کیئے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے سینکڑوں عربی اشعار سے استشہاد کیا۔

کلامِ عرب کی ہمہ پہلو افادیت:

کلامِ عرب سے استفادہ کی روایت مفسرین قرآن کے ہاں ابتدائی دور سے چلی آرہی ہے۔ غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن فہمی میں چند ایک پہلو ایسے ہیں جن میں کلامِ عرب سے مدد لیئے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ ان پہلوؤں میں سے مندرجہ ذیل نمایاں ہیں۔

۱) عربی محاورات اور ان کے محل ستعمال کا علم
۲) نحوی مشکلات کا حل
۳) مشکل اور غریب الفاظ کی تفہیم
۴) قرآن کے ادبی محاسن اور معجزانہ خصائص وغیرہ کی نشاندہی

۵) عربوں کی تہذیب وتمدن سے آگاہی۔

مذکورہ بالا پہلوؤں کے اجمال کی تفصیل ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

۱) عربی محاورات اوران کے محلِّ استعمال کا علم:

قرآن فہمی میں یہ علم مفید ثابت ہوتا ہے اوراس کی تشریح ممکن ہوتی ہے۔مثال کے طور پر **کشف ساق** اہل عرب کا محاورہ ہے جسے عرب سخت مصیبت کے وقت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جب گھمسان کی جنگ ہوتو کہاجاتا ہے۔ **کشف الحرب عن ساقھا** ۔اصل میں جب انسان کسی کام کے لئے کمرِ ہمت باندھتا ہے تو محنت کے لئے ٹخنے چڑھا کر پنڈلی کھول دیتا ہے۔سورۃ القلم کی آیت ﴿ **یوم یکشف عن ساق** ﴾ [7] میں **کشف ساق** سے مراد حضرت عبداللہ بن عباس نے شدت وکرب ہی لیا ہے [8]۔

۲) نحوی مشکلات کا حل:

قرآن مجید کے وہ مشکل مقامات جو نحوی اعتبار سے حل طلب ہیں ان میں ہماری راہنمائی کلامِ عرب کی رہین منت ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی آیت ﴿ **وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَ اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ** ﴾ [9] میں یہ اشکال کہ **ھا** ضمیر کا مرجع صلوۃ ہے یا پھر صبر اور صلوۃ دونوں جب کہ ضمیر مونث ہے۔زیادہ را جح رائے یہ ہے کہ اس کا مرجع صبر وصلوۃ دونوں ہیں۔اس کی تائید کلامِ عرب اور دیگر قرآنی نظائر سے ہوتی ہے کہ جہاں مذکر ومونث کی طرف چیز کے رجوع کے امکانات بالکل واضح ہوں تو بغرض اختصار عمومی قاعدے (ضمیر تثنیہ **ھما**) کے برعکس ضمیر واحد مونث (**ھا**) لائی جاسکتی ہے۔جیسے حماسی شاعر عبداللہ بن الزبیر الاسدی کہتا ہے:

سمعت بکاء با کیۃ و باک ابان الدھر و احدھا الفقید [10]

۳) مشکل اور غریب الفاظ کی تفہیم:

قرآن مجید کے مشکل اور غریب الفاظ کا حل تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالحدیث کے ذریعے تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن بعض مقامات کا حل قرآن، حدیث اور آثار صحابہ سے نہ ملنے کی صورت میں جاہلی ادب سے راہنمائی لینا ضروری ہوتا ہے۔ جب کبھی ایسے مقامات کے حل کے لئے کلامِ عرب سے استفادہ کرنے کی بجائے

محض معمولی لغت دانی پر اکتفاء کیا گیا تو بڑی گمراہیاں پیدا ہوگئیں۔ جیسے معتزلہ کا آیت قرآنی ﴿الی ربھا ناظرہ﴾ میں نظر سے امید و توقع مراد لینا[11]، روافض کا ﴿فما استمتعتم به منهن﴾ سے متعہ مراد لینا[12]، اور سرسید کا ''واضرب بعصاک الحجر'' میں لاٹھی کے سہارے چٹان پر چلنے کا معنی مراد لینا[13] وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

۴) قرآن کے ادبی محاسن اور معجزانہ خصائص وغیرہ کی نشاندہی:

قرآن حکیم رسولؐ اللہ کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور کلامِ عرب سے تقابل کی صورت میں اس کے معجزانہ خصائص نمایاں ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کے ادبی محاسن اور امتیازی خصوصیات بھی ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن نے عربوں کو خود اُن کی اپنی زبان عربی کے کئی ایک الفاظ کے جامع اور فصیح مفاہیم سے آشنا کیا اور ان الفاظ کو نئے اور اچھوتے معانی میں استعمال کیا۔ عربوں کے ہاں لفظ ''توفی'' کے معنی کسی چیز کو پورا پورا لینے کے ہیں لیکن قرآن نے اسے موت کے معنی میں استعمال کیا ہے[14]۔

۵) عرب تہذیب وتمدن سے آگاہی:

عربوں کے سماجی، تاریخی اور جغرافیائی حالات سے آگاہی اور ان کے رسوم و رواج، تہذیب و تمدن اور نظریات سے واقفیت بھی تفسیرِ قرآن میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں اُن سے متعلق آیات موجود ہیں وہاں مذکورہ بالا موضوعات کا علم ہی تفہیم قرآن میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ لہٰذا عربوں کی ثقافت سے آگاہی کی مذکورہ بالا اہمیت کے پیشِ نظر کلامِ عرب کا مطالعہ بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ قرآن حکیم کی آیت مبارکہ ﴿انما النسئی زیادة فی الکفر﴾[15] میں النسی کا لفظ خاص پس منظر کا حامل ہے۔ اس آیت مبارکہ کی صحیح مراد معلوم کرنے کے لئے عربوں کے کلچر کا مطالعہ لازم ہے۔ یہاں ''النسی'' سے مراد بھول چوک ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ عربوں کی خاص عادت ''کسی حرام مہینے کو حلال کر لینا اور اس کی جگہ کسی دوسرے مہینے کو حرام قرار دینا ہے'' کر دینا ہے[16] یعنی اپنے کیلنڈر میں خود ساختہ تبدیلیاں کرنے کی روش کو قرآن کفر میں زیادتی قرار دے رہا ہے۔ وگرنہ محض بھول چوک کفر میں اضافہ تو دور کی بات ہے محض کفر بھی قرار نہیں دی جا سکتی۔

کلامِ عرب سے استشہاد اور مولانا اصلاحی:

تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں کلامِ عرب کو ایک ماخذ کی حیثیت حاصل ہے لہٰذا محققین تفسیر نے تفسیرِ قرآن

کے ذیل میں جن علوم پر دسترس کو لازم قرار دیا ہے اُن میں سے ایک اہم مہارت ''عربیت'' بھی ہے اور یہ پہلو اس وقت تک نامکمل اور غیر مفید رہتا ہے جب تک اس میں کلامِ عرب کی طرف رجوع کو شامل نہ کیا جائے۔ خود صحابہ کرام نے بھی کلامِ عرب سے بطور ماخذ استفادہ کیا۔ کلامِ عرب کے نثری اور شعری مصادر صحابہ کرام کی دسترس میں تھے۔ دیگر ماہرین تفسیر کی طرح مولانا امین احسن اصلاحی بھی کلامِ عرب سے استشہاد کو تفسیرِ قرآن کے ذیل میں ضروری خیال کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک تفسیر کے قطعی اصولوں کی تعداد چار ہے اور ان چار کی فہرست میں عربی زبان میں مہارت اور درک کو اولیت حاصل ہے [17] جس کا اندازہ آپ کی تحریر کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

> ''پہلا اصول یہ ہے کہ تفسیر کا اول ماخذ اس زبان کو بنایا جائے جس زبان میں قرآن مجید اترا ہے۔ قرآن مجید جس زبان میں اترا ہے اس کے لئے آپ کو امراءالقیس لبید، زبیر، عمرو بن کلثوم اور حارث بن ہلزہ وغیرہ اور خطبائے جاہلیت کے کلام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔''[18]

مولانا کے نزدیک قرآن حکیم کی زبان اور اس کے اسالیب کی مشکلات کے حل کے لئے کئی ایک چیزیں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ بہتر اور مفید کلامِ عرب ہی ہے۔ اگرچہ انہوں نے ان معاون چیزوں کی فہرست میں کتب لغت، کتب نحو اور کتب بلاغت کو بھی شامل کیا ہے مگر ان کے نزدیک کلامِ عرب ہی ان سب چیزوں میں معتبر ہے۔ جیسا کہ مولانا اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''قابل اعتماد چیز اس باب میں دراصل کلامِ عرب ہی ہے۔ لفظ کے اصلی حقائق اسی سے کھلتے ہیں۔ پھر اسالیب کلام کا معاملہ تو سرتاسر اسی سے متعلق ہے۔ لفظ سے اسالیب کلام کے بارے میں رہبری نہیں ہوتی۔ لیکن کلامِ عرب میں بھی اصلی اور نقلی دونوں ہیں۔ آدمی کو ایک عرصہ کی مشق کے بعد..... اگر ذوق اچھا ہو..... اصلی و نقلی کے مابین امتیاز ہوتا ہے اور یہ امتیاز نہایت ضروری ہے۔ ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بالکل شاذ اور غیر معروف معنی کو اختیار کر لیتا ہے اور معروف معنی کو چھوڑ دیتا ہے''۔[19]

کلامِ عرب سے مراد عربوں کے دورِ جاہلیت کا وہ ادبی ذخیرہ ہے جو ماقبل اسلام اور صدر اسلام میں عمومی

طور پر دستیاب تھا[20]۔ اگرچہ یہ خطبائے عرب کے خطیبانہ نثری کلام اور جاہلی شاعری دونوں کا مجموعہ ہے مگر مولانا اصلاحی محض جاہلی شاعری پر انحصار کے قائل نظر آتے ہیں۔ جب قرآن کا اسلوب زیادہ تر خطیبانہ ہے تو تفہیم قرآن میں محض جاہلی شاعری ہی کو بنیادی حیثیت کیوں دی جائے؟ اِس نکتے کی حقیقت کو مولانا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ چیزیں یا تو خطبائے عرب کے کلام میں مل سکتی تھیں یا قرآن مجید میں مل سکتی ہیں۔ خطباء کا عربی کلام لوگوں کو ملا نہیں اور قرآن کو لوگوں نے ماخذ نہیں بنایا۔ اس سلسلہ میں باقلانی کی کوشش قابلِ قدر ہے لیکن وہ بھی مجبور ہوئے کہ اصولوں کے استنباط کے لئے شعروں ہی کو ماخذ قرار دیں۔ خطباء کے کلام کی طرف اول تو وہ پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے اور ہوئے بھی تو محض اس قدر کہ ان کے کچھ سرسری نمونے پیش کر سکے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصنیفات میں بہت سے جواہر پارے ملتے ہیں لیکن کاوش اور تلاش کی ضرورت ہے۔''[21]

قرآن مجید کے پیغام کی تفہیم، احکام کے استنباط، مدلوں و منطوق تک رسائی اور حقیقی مفہوم کی تعیین کے لئے جہاں کلامِ عرب سے مدد لینا مولانا کے نزدیک لازمی امر ہے وہیں اُن کے ہاں قرآن کی ادبی لطافتوں اور محاسن کا پتہ لگانے کے لئے بھی نہایت ضروری ہے کہ کلامِ عرب کی طرف رجوع کیا جائے۔ مولانا اپنی مشہور تفسیر ''تدبرِ قرآن'' کے مقدمہ میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''جو شخص قرآن کی زبان کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دورِ جاہلیت کے شعراء و ادبا کے کلام کے محاسن و معائب کو سمجھنے کا ذوق پیدا کرے۔ اس کے بغیر کوئی شخص نہ تو یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن عربی زبان کے محاسن کا کیسا کامل نمونہ ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اندر وہ کیا سحر ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو ہمیشہ کے لئے درماندہ کر دیا۔ اگرچہ اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا بڑا حصہ دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گیا لیکن پھر بھی اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اصل مقصد کے لئے کفایت کرتا ہے''۔[22]

تفسیرِ قرآنی کے سلسلے میں مولانا اصلاحی تاریخی روایات سے مدد لینے کے بھی قائل ہیں مگر اُن کے ہاں یہ تاریخی مواد نا قابل اعتماد ہے۔ اس تاریخی مواد کے نا قابل اعتماد ہونے کی بڑی وجہ اس کا مسخ شدہ ہونا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ ان روایات کی جانچ پرکھ اور ان میں سے کھرے اور کھوٹے کے درمیان امتیاز کی خاطر کوئی کسوٹی تلاش کی جائے اور پھر اس کسوٹی پر ان روایات کو پیش کر کے اپنے لیے رد و قبول کا فیصلہ کیا جائے۔ اس حوالے سے مولانا نے اپنے استاد حمید الدین فراہی کے موقف کی پیروی کی ہے اور اُن کے طریقہ کار کو ہی مبنی بر حقیقت قرار دیا ہے۔ مولانا اپنے استاد کے موقف کو تحریر کرنے کے بعد اُس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کا اصل اعتماد قرآن مجید کے اشارات اور کلامِ عرب پر ہوتا ہے، تاریخ کی روایات کو وہ ہمیشہ انہیں دونوں کسوٹیوں پر رکھ کر قبول کرتے اور حق یہ ہے کہ اس باب میں ان دو چیزوں کے سوا کسی تیسری چیز سے مشکل ہی سے مدد ملتی ہے''۔[23]

تفسیر ''تدبرِ قرآن'' اور کلامِ عرب:

کلامِ عرب کی اہمیت اور ہمہ پہلو افادیت کے باوجود متاخرین مفسرین کرام نے اس سے استفادہ کو اپنا معمول نہیں بنایا۔ نتیجتاً اس سے مستفید ہونے کی روایت میں کمی واقع ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ برصغیر کے مشہور مفسرِ قرآن اور مولانا اصلاحی کے استاد حمید الدین فراہی نے اس پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ انہوں نے جہاں تفسیر القرآن بالقرآن اور نظم قرآن جیسے مسلمہ اصولوں کو بنیادی حیثیت دی وہیں اپنے تحقیقی نتائج کو مدلل بنانے کے لئے کلامِ عرب کے نظائر و شواہد پر بھی انحصار کیا۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں قرآن کے مفردات و اسالیب کی تحقیق اور تفہیم میں کلامِ عرب سے بھرپور استفادہ کیا اور بعض ایسے نتائج اخذ کیے کہ جو ان ہی کا خاصہ اور انفرادیت تھی۔ یعنی ان تک متقدمین میں سے کوئی نہیں پہنچ سکا تھا۔ مولانا اصلاحی نے اس سلسلے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا کہ اپنے استاد کی تحقیقات کو اپنی تفسیر میں سمو دیا۔ مولانا نے مجموعی لحاظ سے ستر کے لگ بھگ جاہلی اشعار سے اپنی تفسیر میں استشہاد کیا۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان ستر اشعار میں سے دو تہائی اشعار ایسے ہیں جنہیں حمید الدین فراہی نے اپنی مختلف تحریروں میں بطور دلیل استعمال کیا، رہے بقیہ ایک تہائی اشعار تو ان کے بارے میں بھی مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس تفسیر کے لئے قلم اٹھانے سے پہلے ادب جاہلی کے اس تمام ذخیرے کو اچھی طرح پڑھ لیا ہے جو مجھے دستیاب ہو سکا اور جو قرآن کی کسی ادبی نحوی اور معنوی مشکل کے حل

کرنے میں کسی پہلو سے مددگار ہوسکتا ہے۔ میں بے تکلف یہ بات بھی اس موقع پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ جو کچھ میں نے کیا ہے، اس میں زیادہ دخل مجھے نہیں بلکہ میرے استاد مولانا فراہی کو ہے۔ انہوں نے اس طرح کی ساری چیزیں پڑھ کر قرآن کی تفسیر میں کام آنے والی ہر چیز کو نشان زد کر دیا تھا۔ میرا کارنامہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے ان چیزوں کو اچھی طرح ہضم کر لیا ہے اور قرآن کی مشکلات حل کرنے، اس کے اسالیب و محاورات کو جانچنے اور اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کو پرکھنے میں اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔''[24]

تفسیر ''تدبرِ قرآن'' میں مولانا اصلاحی نے مختلف، پہلوؤں میں کلامِ عرب سے استشہاد کیا ہے۔ ان مختلف پہلوؤں کا ذیل میں احاطہ کیا جا رہا ہے اور اُن کا الگ الگ جائزہ لیتے ہوئے مثالوں سے بھی مدد لی جائے گی۔

نحوی مسائل کا حل:

فہمِ قرآن کے لیے لازم ہے کہ آیاتِ قرآنیہ میں الفاظ کی نحوی ترکیب معلوم ہو کیونکہ اس کے بغیر درست مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ ''تدبرِ قرآن'' میں مولانا اصلاحی نے کئی ایک مقامات پر کلامِ عرب کی مدد سے نحوی مشکلات کا حل تلاش کیا۔

یہاں بطور مثال قرآن مجید کی آیت ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾[25] پر مولانا کا موقف پیش کیا جا رہا ہے۔ اس آیت کے حوالے سے بہت سے مفسرین کرام نے ''هَلْ'' کے معنی استفہام کی بجائے ''قَدْ'' کے لئے ہیں جب کہ مولانا نے کلامِ عرب سے مدد لیتے ہوئے ''هَلْ'' کو استفہامیہ پیرائے ہی میں لیا ہے۔ مولانا اپنے مؤقف کی تائید میں معلقات کے ایک قصیدے کا درج ذیل مطلع لائے ہیں:[26]

هل غادر الشعراء من متردم ام هل عرفت الدّار بعد توهم[27]

''کیا شاعروں نے شاعری میں کوئی خلا چھوڑ دیا ہے یا تجسّس کے بعد تم نے منزل جاناں کا سراغ پا لیا ہے۔''

اس شعر کو بطور دلیل پیش کرنے کے بعد مولانا اپنے موقف کا منطق پیش کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''یہ ایک بہترین مطلع ہے اور اس کا سارا حسن اس کے خاص قسم کے استفہامیہ اسلوب میں مضمر ہے اگر اس 'هل' کو 'قد' سے بدل دیجئے تو یہ حسن بالکل غائب ہو جائے گا''۔[28]

اسالیبِ قرآن کی تفہیم:

قرآن حکیم میں جن مقامات پر لطیف تعبیرات، استعارات اور کنایات کا استعمال ہوا ہے ان کی درست تفہیم کی خاطر مولانا اصلاحی نے کلامِ عرب کی طرف رجوع کیا ہے۔ مثلاً آیت مبارکہ ﴿وَمَا انا بظلام للعبید﴾[29] میں لفظ **ظلام** کو کئی ایک مترجمین نے ''ظالم'' کے معنی میں لیا ہے حالانکہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس اعتبار سے اس کے کچھ مخصوص معانی ہونے چاہییں تھے۔ لہٰذا مولانا نے کلامِ عرب سے استشہاد کرتے ہوئے اس کے نہ صرف منفرد معانی لئے ہیں بلکہ ان کی توجیہہ بھی کی ہے۔ جیسا کہ آپ لکھتے ہیں:

''جب مبالغہ پر نفی آتی ہے تو اس سے مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ میں بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوں.....کلام عرب میں اس اسلوب کی مثالیں موجود ہیں۔ شعرائے جاہلیت میں سے امراء القیس نے اپنے اشعار میں **المرء لیس بقتا ل** اور **المرء لیس بفعا ل** کی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اس کے حریف نے اس کو جنگ اور قتل کی دھمکی دی تھی تو اس نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ یہ مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ حالانکہ اس بزدل میں قتل وقتال کا ذرا بھی داعیہ نہیں ہے **لیس بفعا ل** اس کے اندر کچھ بھی کر سکنے کا حوصلہ نہیں ہے۔''[30]

ارض القران میں معاونت:

قرآن مجید نے کئی ایک مقامات اور جگہوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ تو ایسے مواقع پر ان کی تحقیق کے لئے مولانا اصلاحی نے کلام عرب سے معاونت لی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیت ﴿وَعَادًا وَّثَمُوْدَ وَاَصْحٰبَ الرَّسِ﴾[31] میں ''رس نامی'' ایک وادی کا تذکرہ ہے۔ لہٰذا اس موقع پر مولانا نے مشہور عرب شاعر زہیر کے ایک مصرعہ سے مدد لی ہے[32] جس میں واضح طور پر معلوم ہو جاتا کہ یہ ''رس'' ایک وادی کا نام ہے۔ مصرعہ یہ ہے ''**وھن و وادی الر س کا لید للفم**''

الفاظ قرآنی کی توضیح:

کلام الٰہی کی تشریح وتعبیر کے ذیل میں مولانا اصلاحی نے جن پہلوؤں میں کلام عرب سے استشہاد کیا ہے ان میں سے ایک اہم اور نمایاں پہلو قرآنی الفاظ کے معانی کی تعیین بھی ہے۔اس پہلو میں آپ کے تفردات اہمیت کے حامل ہیں۔آپ نے اپنے پیش رو مفسرین کے بیان کردہ معانی میں موافقت کی صورت میں بھی کئی ایک مقامات پر اشعار سے استدلال کیا ہے اور تفردات کی تو بنیاد ہی کلام عرب ہے۔جیسا کہ ذیل کی مثال سے واضح ہو رہا ہے۔

قرآن مجید کی مشہور آیت مبارکہ ﴿ اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ ﴾[33] کے لفظ **یا مر کم** کے معنی کا تعین کرتے ہوئے مولانا نے جاہلی شاعر درید بن الصمہ کے شعر سے استشہاد کیا اور مذکورہ بالا قرآنی جملے کا ترجمہ یوں کیا۔

''وہ (شیطان) تو تمہیں بس برائی اور بے حیائی کی راہ سوجھائے گا''[34]

حالانکہ آپ سے قبل کئی مفسرین نے لفظ ''**یامر کم**'' کا ترجمہ ''تمہیں حکم دے گا'' وغیرہ کیا ہے۔مگر مولانا نے یہاں حکم دینے کی بجائے کوئی بات سوجھانے یا اس کا مشورہ دینے کے معانی کو ترجیح دی ہے اور بطور دلیل درید بن الصمہ کا درج ذیل شعر لے کر آئے ہیں۔

امر تھم امر ی بمنعرج اللو ی　　فلم یستبینوا لر شد الاضحی الغد [35]

جاہلی تصورات سے واقفیت:

قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب ہی تھے لہذا کلام الٰہی نے ان کے تصورات اور عقائد کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی۔اس سلسلے میں قرآن حکیم نے اہل عرب کے اشکالات اور سوالات کو اہمیت دی اور ان کے تسلی بخش جوابات دیئے تاکہ عرب اپنے عقائد اور تصورات کی اصلاح کر سکیں۔قرآن نے جہاں سوالات کے جوابات کا سلسلہ جاری رکھا وہیں بغیر سوالات کے از خود بھی ان عقائد اور تصورات پر تنقید کی اور غلط تصورات کی بجائے درست عقائد اور تصورات کی تعلیم دی۔مولانا اصلاحی نے دورانِ تفسیر مذکورہ بالا قرآنی مقامات پر کلام عرب سے استفادہ کیا اور ضروری تفصیلات حاصل کیں۔مثلاً عربوں کے ہاں پہاڑوں جیسے دیوہیکل اجسام کی ابدیت کا غلط تصور پایا جاتا تھا

اس تناظر میں قرآن نے ان کے اشکال کا تذکرہ ایک آیت ﴿ وَيَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا ﴾[36] میں کیا۔اس مقام کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا اصلاحی نے کلام عرب سے استشہاد کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ (اہل عرب) اس مغالطہ میں مبتلا تھے کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی دن روئے زمین سے یہ تمام پہاڑ غائب ہوجائیں۔عوام تو درکناران کے بہت سے دانشوروں تک کا خیال یہ تھا کہ پہاڑ غیر فانی ہیں۔زبیر جو عرب کے حکیم شعراء میں سے ہے کہتا ہے کہ: الا ار یٰ علی الحوادث با قیا ولا خا لدا الا الجبال الرواسیا ''[37]

مجازی معانی کی تعیین:

کلام الٰہی میں کئی ایک مقامات پر الفاظ کے حقیقی معانی کے ساتھ ساتھ مجازی معنی بھی مراد لیئے گئے ہیں۔ اس طرح کلام میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ ان مواقع سے قرآن کی فصاحت و بلاغت کا اظہار ہوتا ہے۔''تدبرِ قرآن'' میں ایسے مواقع پر کلامِ عرب سے استشہاد کرتے ہوئے لطیف معانی اخذ کیئے گئے ہیں۔صاحبِ ''تدبرِقرآن'' نے قرآن مجید کی آیت ﴿وَثِيَابَکَ فَطَهِّرْ ﴾[38] میں ثِیَابَ سے مراد دامنِ دل لیا ہے۔وہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کلامِ عرب کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مفہوم میں بھی آتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں ''دامن دل'' سے تعبیر کرتے ہیں۔امراء القیس کا مشہور شعر ہے: وان تک قد ساء تک منی خلیقة تسلی ثیابی من ثیابک تنسل''[39]

محلِّ نظر پہلو:

مذکورہ بالا جائزے سے عیاں ہوتا ہے کہ تفسیر ''تدبرِقرآن'' میں کلامِ عرب سے استشہاد کی روایت اسے نہ صرف ہم عصر تفاسیر سے الگ کرتی ہے بلکہ پہلے سے موجود دیگر تفاسیر سے بھی اسے منفرد بناتی ہے۔یہ بات عین حقیقت ہے کہ لغت وکلام عرب سے استفادہ ہی اس تفسیر کا طرہ امتیاز ہے۔ تاہم تفسیر ہذا کے مطالعہ کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ چند ایک پہلو اصلاح کے متقاضی ہیں۔اگر ان پہلوؤں کی کمزوریوں کو دور کر دیا جائے تو چار چاند لگ

سکتے ہیں۔ ذیل میں ایسے سقیم اور اصلاح طلب پہلوؤں میں سے چند ایک کی نشاندہی بطور مثال کی جارہی ہے۔

☆ عربی زبان وادب کئی ایک الفاظ میں کلام الٰہی کا مرہونِ منت ہے کہ اس نے جہاں عربی زبان کے ذخیرہ کو وسعت دی وہاں اسے ایسے مختصر، جامع اور فصیح الفاظ سے آشنا کرایا جن سے عرب بالکل ناواقف تھے۔ مولانا فراہی نے اپنے رسالے ''اسالیب قران'' میں قرآن حکیم کے بعض نئے اسالیب سے متعارف کروایا ہے جو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ مولانا اصلاحی سے اس بارے میں بعض مقامات پر ترجمے میں تسامح محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے آیت قرآنی ﴿وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾[40] کا ترجمہ کیا ہے ''اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس میں خدا ہی سہارا ہے۔''[41] وصف مادے سے قرآن مجید میں یہ لفظ کل چودہ مقامات پر استعمال ہوا ہے[42] اور کسی ایک مقام پر بھی مطلق ''بیان کرنے'' کے معنی میں نہیں آیا بلکہ ہر جگہ دروغ گوئی، افترا پردازی، غلط بیانی اور بات گھڑنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے: ''جو تم باتیں بنا رہے ہو اس میں خدا ہی سہارا ہے۔''

☆ ''تدبرِ قرآن'' میں کئی ایک مقامات پر الفاظِ قرآنی کی تحقیق میں جاہلی اشعار سے راہنمائی لیتے ہوئے سیر حاصل بحث موجود ہے اور اس حوالے سے لطیف نکات کو دریافت کیا گیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس طرح کی کاوش جہاں تفسیر اور تشریح کے ضمن میں کی گئی ہے اس کی جھلک ترجمے میں نظر نہیں آتی، یعنی تفسیر میں موجود خوبصورت نکات کا عکس ترجمے میں موجود نہیں ہے۔ حالانکہ ترجمہ اور تفسیر میں عدم موافقت کو ختم کرنے سے مزید خوبیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ بطورِ مثال آیتِ قرآنی ﴿ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾[43] کے حوالے سے تدبرِ قران کے ترجمے اور تفسیر کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا کی رائے میں لفظ ''ظن'' شک کا ہم معنی بھی ہے اور یقین کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دیگر کئی تفاسیر میں مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں ظن سے مراد یقین ہی لیا گیا ہے[44] مگر مولانا نے اس موقع پر لفظ گمان سے ترجمہ کیا ہے[45]۔ حالانکہ ان کی تفسیر کے مطابق یہاں یقین کے معنی مراد لینا ممکن تھا اور سیاقِ کلام بھی اِسی کا تقاضا کر رہا تھا۔

☆ مترجمین خواہ کسی بھی زبان کے ہوں اُن کے ہاں کلام کے سیاق وسباق کی تبدیلی سے معانی کی تبدیلی ایک مسلّمہ امر ہے۔مگر ''تدبرِقرآن'' میں یکساں سیاق وسباق کی حامل آیات کا ترجمہ کرتے ہوئے مختلف جگہوں پر یکسانیت کی بجائے اختلاف نظر آتا ہے جب کہ سیاق وسباق کی یکسانیت ترجمہ کی یکسانیت کا تقاضا کرتی ہے۔ قرآن مجید کی آیت ﴿ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴾[46] اس حوالے سے نمایاں مثال ہے۔مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں موجود لفظ ''بلاء'' اسی طرح کے سیاق وسباق میں کئی ایک دیگر مقامات پر استعمال ہوا ہے۔یہ لفظ سورۃ بقرہ آیت نمبر ۴۹ کے علاوہ سورۃ الاعراف آیت نمبر ۱۴۱، سورۃ ابراہیم آیت نمبر ۶، سورۃ انفال آیت نمبر ۱۷ اور سورۃ الدخان آیت نمبر ۳۳ میں ایک ہی سیاق وسباق میں استعمال ہوا ہے۔مگر مولانا نے ''تدبرِقرآن'' میں بالترتیب پہلے تین مقامات پر اس کا ترجمہ '' آزمائش'' پھر اگلے ایک مقام پر '' جوہر نمایاں کرنا'' اور آخری مقام پر '' انعام'' کیا ہے[47]۔

☆ کلامِ عرب سے استفادہ اگرچہ ''تدبرِقرآن'' کی نمایاں خصوصیت ہے مگر کئی ایک ایسے مقامات ہیں جو کلامِ عرب سے استدلال کے متقاضی تھے مگر نہ تو یہاں کوئی جاہلی شعر لایا گیا اور نہ ہی قرآنی نظیر بطور دلیل پیش کی گئی۔ان مقامات میں سے ایک مقام تفسیر مذکورہ کو کھولتے ہی بالکل آغاز پر نظر میں آتا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کی ابتدائی آیت مبارکہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ کا پہلا لفظ ہی اس کی مثال ہے۔''**الحمد**'' کا ترجمہ ''شکر'' کیا گیا ہے۔اس کی توجیہہ کرتے ہوئے مولانا اصلاحی نے لکھا ہے:

> ''شکر کا مفہوم اس لفظ کا جزو غالب ہے اس وجہ سے اس کے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لئے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی ملانا ہوگا یا پھر شکر ہی کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا''[48]۔

گویا مولانا کے نزدیک لفظ **الحمد** میں تعریف کے معنی بھی پائے جاتے ہیں مگر ان پر شکر کا مفہوم غالب ہے اور اسی وجہ سے اس کے ترجمہ میں تعریف کی بجائے شکر کے معنی کو ترجیح دی گئی ہے۔اُردو کے اکثر تراجم میں اس مقام پر تعریف کے معنی لئے گئے ہیں۔مولانا نے اکثر مترجمین کے برعکس جو موقف اپنایا ہے وہ ضرورت پیدا کرتا ہے کہ بطور دلیل قرآنی نظائر یا کلام عرب لائے جاتے۔لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس اہم مقام پر کوئی وجہ اور دلیل

ذکر نہیں کی گئی۔ رہا مولانا کا یہ موقف کہ ''شکر کا مفہوم اس لفظ کا جزو غالب ہے'' تو لازم تھا کہ قرآن مجید کے دیگر مقامات پر جہاں جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا وہاں شکر کا عکس موجود ہو لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے کہ بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا مگر شکر کا مفہوم غالب تو کیا شامل بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ ذیل میں چند ایک ایسے مواقع درج کیئے جا رہے ہیں۔

''قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ''[49]

''وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ''[50]

''وَ هُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ وَ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ''[51]

''وَ لَهُ الْحَمْدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ''[52]

''فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''[53]

''يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ''[54]

''وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا''[55]

☆ مولانا اصلاحی کئی ایک مقامات پر اپنے تفسیری موقف کی تائید میں جاہلی اشعار بطور دلیل لائے ہیں۔ لیکن ان میں سے چند ایک ایسے بھی ہیں کہ جہاں نقل کردہ اشعار اس موقف سے ہم آہنگی نہیں رکھتے اور اس عدم مطابقت سے شعر کے نقل کرنے کا مقصد ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید کی آیت ﴿ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾[56] قابل ذکر ہے۔ مذکورہ بالا آیت مبارکہ کے لفظ سُجَّدًا کی حقیقت کی بابت مولانا یوں رقم طراز ہیں:

''سجدہ کے اصل معنی سر جھکانے کے ہیں، اس سر جھکانے کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں اس کی کامل شکل زمین پر پیشانی رکھ دینے کی ہے جو ہم نماز میں اختیار کرتے ہیں۔ عمرو بن کلثوم

نے اپنے مشہور فخریہ شعر میں اس کا یہی مفہوم مراد لیا ہے۔

اذا بلغ الفطام لناصبی تخرله الجبابر ساجد ینا

(جب ہماری قوم کا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی مدت کو پہنچ جاتا ہے تو بڑے بڑے جبار اس کے آگے سجدوں میں گر جاتے ہیں)۔ یہاں آیت میں اس سے مراد صرف سر جھکانا ہے موقع کلام اس پر دلیل ہے''۔[57]

گویا صاحب تدبر قرآن کے نزدیک سُجَّداً سے مُراد محض سرنگوں ہونا ہے لیکن عمرو بن کلثوم کا وہ مذکورہ بالا شعر نقل کیا ہے جس سے مکمل زمین پر گرنے اور سجدہ ریز ہونے کا مفہوم حاصل ہو رہا ہے۔ اس سلسلے کی دوسری مثال سورۃ لہب کی ابتدائی آیت مبارکہ ہے کہ اس کی تشریح کے دوران صاحبِ ''تدبرِ قرآن'' رقم طراز ہیں:

''تب'' کے معنی ہلاک ہونے اور خسارہ میں پڑھنے کے ہیں۔ اس سے ''تبت یدا'' کا محاورہ نکلا جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ فلاں کے دونوں ہاتھ حصول مقصد میں ناکام و عاجز رہے، دونوں ہاتھوں کی ناکامی اور بے بسی کامل بے بسی کی تعبیر ہے۔ اگر کہیں کہ ''تبت یداہ'' تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ مقابلہ کرنے سے عاجز ہو گیا اس طرح کسر ید (ہاتھ توڑ دینا) کسی کا زور توڑ دینے کی تعبیر ہے فند الزمانی کا شعر ہے۔

و ترکنا دیار تغلب تفرا و کسرنا من الغواه الجناحا

(ہم نے تغلب کے علاقہ کو چٹیل بنا کے چھوڑ دیا اور ان کے سرکشوں کے بازو توڑ دیئے)۔''[58]

بطور دلیل لائے گئے اس شعر میں ''تبت یدا'' کی ترکیب استعمال ہی نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی کوئی اس ترکیب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ کوئی ایسا شعر لایا جاتا جس میں یہ ترکیب استعمال ہوئی ہوتی۔ حالانکہ جاہلی شاعری کے دستیاب ذخیرے میں ایسا شعر موجود ہے جس میں یہ ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ علامہ ابن منظور نے اس شعر کو نقل کیا ہے۔

اخسر بها من صفقة لم تستقل تبت ید اصا فقها ما ذا فعل[59]

☆ مفسرین کرام کے ہاں اصول تفسیر کے سلسلے میں ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کی حیثیت مسلمہ ہے۔ اور اس اصول کو عہد نبوی سے عصر حاضر تک مسلسل تفسیرِ قرآنی میں استعمال کیا جارہا ہے۔ دیگر ماہرین تفسیر کی طرح خود مولانا اصلاحی کے نزدیک بھی یہ اصول سب سے زیادہ قابلِ اطمینان ہے[60]۔ مگر اس اہم اور کلیدی حیثیت کے باوجود تدبرِ قرآن میں بعض جگہوں پر اپنے موقف کی تائید میں محض کلام عرب سے استفادہ پر ہی اکتفا کر لیا گیا ہے اور اہم اصولِ تفسیر ''تاویل القرآن بالقرآن'' سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ حالانکہ ایسے مقامات خود قرآنی نظائر سے استشہاد کا تقاضا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے سورۃ القیامہ اور سورۃ آل عمران کے دو مختلف مقامات بطور مثال پیش کیے جارہے ہیں۔

قرآن حکیم نے رسول اللہ کی بابت فرمایا:

''ثُمَّ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ''[61]۔

اس آیت مبارکہ کے حوالے سے بعض مفسرین نے نبی اکرم کو تصدیق کرنے والا قرار دیا اور بعض نے آپ کے لئے یہاں سے مصداق کے معنی اخذ کئے ہیں۔ امام رازی کی طرح[62] مولانا اصلاحی نے بھی آپ ﷺ کو اس مقام پر تورات اور انجیل کا مصداق ہی قرار دیا اور اپنے موقف کی تائید میں مندرجہ ذیل شعر لائے ہیں۔[63]

فد ت نفسی وما ملک یمینی فو ا رس صدقوا فیھم ظنو نی

اگرچہ مولانا نے مندرجہ بالا شعر لا کر اپنی بات کو مدلل کیا ہے۔ مگر گنجائش باقی رہتی ہے کہ اس مقام کو قرآنی نظارئے سے بھی مزین کیا جاتا تاکہ بات مزید واضح ہو جاتی حالانکہ مندرجہ ذیل دو آیات قرآنی بطور دلیل پیش کی جاسکتی تھیں۔

''وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰا اِبْرَاهِيْمُo قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَاo''[64]

''وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ''[65]

دوسری مثال سورۃ القیامہ کی آیات مبارکہ ''اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى o ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى''[66] کی ہے۔ یہاں صاحبِ تدبرِ قرآن نے ''افسوس ہے تجھ پر'' ترجمہ کیا ہے[67] اور بطور دلیل خنساء کا مشہور شعر: ''ھممت

بنفسی کل الھموم فاولیٰ لنفسی اولی لھا'' پیش کیا ہےاوراس موقع پر اپنے پیش رومفسرین میں سے سید مودودی سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے ترجمے پر تنقید کی ہے۔ چونکہ سید صاحب نے ''یہ روش تیرے لئے سزاوار ہے'' ترجمہ کیا تھالہذا مولانا نے اسے عربیت کے خلاف اور سیاق وسباق سے بے جوڑ قرار دیا ہے جہاں تک عربیت کا تعلق ہے تو اس کے لئے تو مولانا نے مندرجہ بالا شعر سے استشہاد کیا ہے مگر سیاق وسباق کے متعلق دعویٰ کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ جب کہ سید مودودی اپنے ترجمے کی توجیہہ کرتے ہوئے اِسے موقع ومحل سے مناسب قرار دیتے ہیں اوراس کی بنیاد حافظ ابن کثیر کی تفسیر پر رکھتے ہیں[68]۔اس اہم مقام پر ضرورت اس امر کی تھی کہ مولانا اصلاحی کلام عرب کے ساتھ ساتھ قرآنی نظائر سے بھی استشہاد فرماتے۔جیسا کہ سورۃ محمد کی آیت نمبر بیس میں بھی ''**فاولی لھم**'' اِسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

☆ ''تدبرِ قرآن'' میں کلامِ عرب سے استشہاد کی روایت اپنی مثال آپ ہے لیکن انسانی کاوش ہونے کی وجہ سے کوتاہیوں سے پاک نہیں ہے۔اعلیٰ ترین انسانی دماغ بھی بروقت برابر بیدار رہنے سے قاصر ہوتا ہے لہذا تدبر قرآن میں موجود کوتاہیوں سے اس کتاب کی اہمیت اور انفرادیت میں کمی نہیں واقع ہوتی۔تاہم ان کی نشاندہی سے مزید بہتری کی امید کی جاسکتی ہے۔اس کتاب میں جاہلی اشعار کے استفادہ کے حوالے سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعض مقامات پر اشعار کی نقل میں سہو ہوگیا ہے۔اصل اشعار اور نقل کئے گئے اشعار میں الفاظ کا فرق موجود ہے۔ ان میں سے چند ایک ذیل میں جدول کی صورت میں درج کئے جارہے ہیں۔

شاعر کا نام	نقل شدہ شعر یا مصرع	اصل شعر یا مصرع
زہیر	**ولونال اسباب السماء بسلّم**[69]	**و ان یرق اسباب السماء بسلم**[70]
زہیر	**وھن ووادی الرس کالید للفم**[71]	**فھن ووادی الرس کالید للفم**[72]
نابغہ زبیانی	**من آل میه رایح او مغتدی**[73]	**امن آل میه رائح و مغتد**[74]
	عجل فا زاد و غیر مزود	**عجلان ذازاد و غیر مزود**

امراءالقیس فلو کان اهل الدار فیها کعهدنا[75] فلوان اهل الدار فیها کعهدنا[76]

وجدت مقیلا عندهم و معرّسا وجدت مقیلا عندهم و معرّسا

☆ ''تدبرِ قرآن'' کے بعض مقامات ایسے ہیں جہاں اشعار سے استدلال کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات کسی بھی دوسری تفسیر کے لئے قابلِ ذکر نہیں ہے لیکن ''تدبرِ قرآن'' کے حوالے سے اس لیے قابل ذکر ہے کہ کلامِ عرب سے استشہاد اس کتاب کی نمایاں خصوصیت ہے اور اس کے مؤلف نے اس اصول کو بنیادی اور اولین حیثیت دی ہے۔ کلامِ عرب سے استدلال کے متقاضی مقامات میں سے محض دو مقامات کی نشاندہی ذیل میں کی جارہی ہے۔

رویتِ یوسف کے وقت خواتین مصر کے بارے میں قرآن مجید کی خبر ﴿وَ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ﴾[77] کا ترجمہ اکثر مترجمین نے ''ہاتھ کاٹ لیئے'' وغیرہ ہی کیا ہے جن میں شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، اشرف علی تھانوی، فتح محمد جالندھری، مولانا جوناگڑھی، وحید الزمان امرتسری، محمود الحسن، امیر علی، صلاح الدین یوسف، پیر کرم شاہ الازہری اور سید مودودی شامل ہیں[78]۔ لیکن مولانا اصلاحی نے اس کا ترجمہ ''انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیئے'' کیا ہے[79]۔ مذکورہ بالا نمایاں مترجمین سے اختلاف تقاضا کرتا ہے کہ اِس موقع پر اختلافی موقف کو دلیل سے مزین کیا جاتا اور کسی جاہلی شاعر کا کوئی شعر بطور دلیل پیش کیا جاتا۔

اشعار جاہلی کے متقاضی مقامات کی دوسری مثال سورہ فاتحہ کی ابتدائی آیت مبارکہ کا ترجمہ ہے۔ جہاں مولانا نے **الحمد** کا ترجمہ شکر کیا ہے ان کے نزدیک **الحمد** میں شکر کا مفہوم غالب ہے مگر اپنے موقف کی تائید میں کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی[80]۔ عام مفہوم سے ہٹ کر جو ترجمہ اور تشریح کی گئی ہے اس کی تائید کے لئے لازم تھا کہ کلامِ عرب سے استدلال کیا جاتا۔

حوالہ جات

1) ابن رشیق، ابی علی الحسن، کتاب العمدہ، 209/1, 95/1 دارالمعرفۃ، بیروت، س ن

2) قرطبی، ابی عبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، 111/10، دارالکاتب العربی قاہرہ، 1367ھ

3) سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمٰن بن ابوبکر، الاتقان فی علوم القرآن 113/1، م ن (طبع ثانی) قاہرہ 1935ء

4) ایضاً، 133-120/1

5) محمود احمد غازی، ڈاکٹر، محاضرات قرآنی، 176 - 178، الفیصل ناشران لاہور، 2004ء

6) الاتقان، 119/1

7) القلم 42:68

8) الجامع لاحکام القرآن، 249/18

9) البقرہ 45:2

10) ابوتمام، حبیب بن اوس طائی، دیوان الحماسہ، ص:247، مکتبہ المعارف العلمیہ، لاہور، 1970ء

11) زمخشری، محمود بن عمر جاراللہ، الکشاف عن حقائق التنزیل، 238/1، مکتبہ الاعلام الاسلامی قم، 1419ھ

12) طبری، ابن جریر، ابوجعفر محمد، جامع البیان فی تفسیر القرآن، 8/5، دارالمعرفۃ، بیروت، 1978ء
رازی، فخر الدین، محمد بن عمر، التفسیر الکبیر، 49/10-53، دارالکتب العلمیۃ طہران، س ن

13) سرسید احمد خان، تفسیر القرآن، 117/1، دوست ایسوسی ایٹس لاہور، 1955ء

14) السجدۃ 11:32

15) التوبہ 37:9

16) مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، تفہیم القرآن، 192/2، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور

17) اصلاحی، امین احسن، مولانا، تدبر قرآن، 16/1، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1999ء

18) اصلاحی، امین احسن، مولانا، مبادی تدبر قرآن، 191-192، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1999ء

19) ایضاً، ص: 68

20) محاضرات قرآنی، ص: 176

21) مبادی تدبر قرآن، ص: 69

22) تدبر قرآن، 15/1

23) مبادی تدبر قرآن، ص: 66

24) تدبر قرآن، 15/1-16

25) الدھر 1:76

26) تدبر قرآن، 105/9

27) یہ معلقہ عشرہ میں شعر نمبر دو ہے۔

28) تدبر قرآن، 105/8

29) قٓ 29:50

30) تدبر قرآن، 555/7

31) الفرقان 38:25

32) تدبر قرآن، 468/5

33) البقرۃ 169:2

34) تدبر قرآن، 393/1

35) دیوان الحماسہ، باب المیراثی، ص:212 ؛ تدبر قرآن، 410/1

36) طٰہٰ 105:20

37) تدبر قرآن، 92/5

38) المدثر 4:74

39) تدبر قرآن، 44/8

40) یوسف 18:12

41) تدبر قرآن، 195/4

42) النحل 62:16؛ النحل 116:16؛ یوسف 77:12؛ الانبیاء 18:21؛ الانبیاء 112:21؛ الانعام 100:6؛ الانبیاء 22:21؛
المومنون 91:23؛ المومنون 96:23؛ الصّٰفّٰت 159:37؛ الصّٰفّٰت 180:37؛ الزخرف 82:43؛ الانعام 139:6 ۔

43) البقرہ 46:2

44) الازہری، پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، 54/1، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، 1402ھ
ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم، 88/1، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، 1969ء
سید قطب، فی ظلال القرآن، 86/1، دار احیاء والتراث العربی، بیروت، لبنان، س ن
الجامع لاحکام القرآن، 375/1
جامع البیان فی تفسیر القرآن، 207-206/1

45) تدبر قرآن، 175/1

46) البقرہ 49:2

47) تدبرقرآن میں ان مقامات کے بالترتیب یہ صفحات ہیں۔206/1، 333/3، 310/4، 443/3، 280/7

48) تدبرقرآن، 56/1

49) النمل 59:27

50) النمل 93:27

51) القصص 70:28

52) الروم 18:30

53) الجاثیۃ 36:45

54) التغابن 1:64

55) بنی اسرآئیل 111:17

56) البقرۃ 58:2

57) تدبرقرآن، 220-219/1

58) تدبرقرآن، 632/9

59) ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، 226/1، دارصادر بیروت، 1956ء

60) تدبرقرآن، 42/1

61) آل عمران 81:3

62) التفسیر الکبیر، 128/8

63) تدبرقرآن، 135/2

64) الصّٰفّٰت 105-104:37

65) سبا 20:34

66) القیامۃ 35-34:75

67) تدبرقرآن، 95/9

68) تفہیم القرآن، 176/6

69) تدبرقرآن، 226/5

70) دیوان زہیر بن ابی سلمیٰ، ص: 87

71) تدبر قرآن، 468/5

72) دیوان زہیر بن ابی سلمٰی، ص: 77 280/7

73) تدبر قرآن، 210/1

74) دیوان نابغہ ذبیانی، ص: 38

75) تدبر قرآن، 152/4

76) دیوان امراء القیس، ص : 117

77) یوسف 31:12

78) ابن عباس، عبداللہ، تفسیر ابن عباس (مترجم)، 80/2، کلام کمپنی کراچی، س ن
شاہ رفیع الدین، قرآن مجید مترجم، 287، شیخ محمد اشرف، لاہور، س ن
ثناء اللہ امرتسری، قرآن مجید مع تفسیر ثنائی مکمل، 285، ثنائی اکادمی، لاہور، س ن
تھانوی، اشرف علی، بیان القرآن، 246، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، 1425ھ
جالندھری، فتح محمد خان، قرآن حکیم مترجم، 296، قرآن سوسائٹی پاکستان، گجرات، س ن
محمود الحسن، شیخ الہند، القرآن الکریم وترجمۃ معانیہ وتفسیرہ الی اللغۃ الاردیۃ، 317 مجمع الملک فہد للطباعۃ المصحف الشریف، المدینۃ المنورۃ، س ن
امیر علی، ملیح آبادی، سید، مواہب الرحمٰن، پارہ بارہ، 218/4، مکتبہ رحمایہ، اردو بازار، لاہور، س ن
تفہیم القرآن، 397/2
ضیاء القرآن، 427/2

79) تدبر قرآن، 204/4

80) تدبر قرآن، 56/1